



محدث فتویٰ
ISLAMIC RESEARCH COUNCIL

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک عالم کہتا ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کو بلا کیف مستوی علی العرش مانے وہ کافر ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ ہر ایک آدمی کے سینے میں موجود ہے جس طرح حدیث ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا

اللہ تعالیٰ، زمین اور آسمان کی پیمائش مت کریں صرف مسلمان مرد کے دل کی پیمائش کریں۔ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ عرش پر نہیں ہے بلکہ ہر ایک آدمی کے سینے میں ہے آیا یہ بات درست ہے یا نہیں؟ ۛنوا بلدیلیل توجروا بحرا بحریل۔

الجواب بعون الوهاب بشرط صحة السؤال

و علیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

الحمد للہ، والصلوة والسلام علی رسول اللہ، أما بعد!

قرآن کریم میں کتنی ہی جگہوں پر اللہ تعالیٰ کا عرش عظیم پر مستوی ہونا ثابت ہے مثلاً سورۃ اعراف میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

إِنَّ رَبَّنَا عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (الاعراف: ۵۴)

"بے شک تمہارا رب اللہ ہے، جس نے آسمانوں اور زمین کو کھجھ دن میں پیدا کیا، پھر عرش پر بلند ہوا۔"

إِنَّ رَبَّنَا عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (النس: ۳)

"بے شک تمہارا رب اللہ ہے، جس نے آسمانوں اور زمین کو کھجھ دن میں پیدا کیا، پھر عرش پر بلند ہوا۔"

لَهُ لَدَى رَفْعِ السُّبُوتِ بَعْضُهُمْ رُفُوًّا عَلَى الْآخَرِ (الرعد: ۲)

"اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں کو بلند کیا بغیر ستونوں کے، جنہیں تم دیکھتے ہو، پھر وہ عرش پر بلند ہوا۔"

الزُّخْرُفُ عَلَى الْفَرْشِ اسْتَوَى (طہ: ۵)

"وہ بے حد رحم والا عرش پر بلند ہوا۔"

لَدَى قَلْبٍ لِّسُبُوتٍ وَ لِّلْأَرْضِ فَنَاقِصَاتٍ فِي شَيْءٍ نَّامٍ (الفرقان: ۵۹)

"وہ جس نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر وہ عرش پر بلند ہوا۔"

لَهُ لَدَى قَلْبٍ لِّسُبُوتٍ وَ لِّلْأَرْضِ فَنَاقِصَاتٍ فِي شَيْءٍ نَّامٍ (الجمہ: ۴)

"اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین اور ان دونوں کے درمیان کی ہر چیز کو کھجھ دنوں میں پیدا کیا، پھر وہ عرش پر بلند ہوا۔"

هُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَى عَلَى الْفَرْشِ (الحمد: ۴)

"وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو کھجھ دن میں پیدا کیا، پھر وہ عرش پر بلند ہوا۔"

ان تمام آیات میں اللہ تعالیٰ کا عرش عظیم پر مستوی ہونا واضح طور پر ثابت ہے اور اللہ تعالیٰ کا عرش پر استوی اس کی صفت ہے اور اللہ کی صفات کے بارے میں صحابہ رضی اللہ عنہم، تابعین، تبع تابعین اور سلف صالحین کا یہی مسلک ہے (یہی مسلک اصح اور اسلم ہے) کہ اللہ تعالیٰ کی تمام صفات جو قرآن کریم سے اور صحیح احادیث رسول ﷺ سے ثابت ہیں ان کو ویسے ہی ماننا ہے جس طرح کتاب و سنت میں وارد ہوئی ہیں۔ ان کی لغوی معنی تو ہمیں معلوم ہے لیکن ان کی کیفیت کے بارے میں نہ ہمیں کچھ معلوم ہے اور نہ ہی کوئی ایسا ذریعہ یا وسیلہ ہے جس کی بنا پر ان کی کیفیت معلوم کر سکیں۔ یہ مسلم قانون ہے کہ صفات ذات تابع ہوتی ہیں جب کہ اللہ جل و علی شانہ کی

ذات پاک بے مثل ہے تو اس کی صفات بھی بے مثل ہوں گی، خالق اور مخلوق کی صفات میں صرف لفظی اشتراک ہے باقی معنی اور مفہوم کے لحاظ سے مخلوق کی صفات اس بے مثل ذات پاک کی صفات سے کوئی اشتراک نہیں رکھتی مثلاً انسان کو بھی سمجھ اور بصیرت کہا گیا ہے جس طرح سورۃ الدھر کے اندر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

إِنَّا عَلَّمْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ نُطْقِهِ أَنشَأَ بِحَبْنِهِ فَخَلَقْنَا سَمِيَّةً مَبْصِيرًا (الدھر: ۳)

”یعنی انسان کو بھی سننے والا اور دیکھنے والا بنایا گیا ہے۔“

اور ہاں ”سمجھ اور بصیر“ اللہ تعالیٰ کی بھی صفات ہیں مگر ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ سورہ شوریٰ کے اندر فرماتے ہیں :

لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ (الشوریٰ: ۱۱)

”کہ اللہ تعالیٰ سننے والا اور دیکھنے والا ہے لیکن اس کا سننا اور دیکھنا بے مثل ہے۔“

یعنی سننے اور دیکھنے میں ہماری طرح آنکھوں اور کانوں کا محتاج نہیں ہے۔ یہی حکم اللہ تعالیٰ کی باقی تمام صفات کا ہے۔ مثلاً اللہ کا کلام کرنا، اللہ کا غضب اور رضا مندی، بندوں سے محبت کرنا ان پر غصہ کرنا۔

یہ (ہاتھ) عین (آنکھ) وجہ (چہرہ) وغیرہ تمام کو ویسے ہی مانتا ہے جس طرح کتاب و سنت میں وارد ہوا ہے۔ نہ کہ ان کے اندر تاویل کی جائے گی اور نہ ہی ان کا معنی مفہوم ایسا لیا جائے گا جو مخلوق سے مشابہت کی طرف فحش ہو، درحقیقت اللہ تعالیٰ کی صفات بھی مشابہت کے باب سے ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان مشابہت کے نزول اور بیان کا آخر مقصد کیا ہے کہ ہم انسانوں کو ان کے پورے مفہوم اور کیفیت کا علم ہی نہیں؛ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی معرفت صرف اس کی صفات کے علم سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ کیونکہ ہم اللہ تعالیٰ کو دیکھ نہیں سکتے، مثلاً کسی ملک کا بادشاہ ہویا دوسری کوئی بڑی ہستی ہو وہاں تک لوگوں کی رسائی نہ ہو اور اس کے متعلق واقفیت صرف اس کی صفات سے ہو سکتی ہو، یعنی ہمیں علم کے صحیح ذرائع سے معلوم ہو کہ وہ بادشاہ عدل و انصاف والا ہے، اپنی رعیت پر رحم کرنے والا ہے، ان کی تکالیف پر خبرگیری اور مدد کرنے والا ہے، وغیرہ وغیرہ تو اس کی ان خوبیوں کی اعلیٰ صفات کی معرفت سے ہمیں اس کے بارے میں کافی حد تک صحیح علم ہو جاتا ہے، اس لیے وہ عوام جس کو اپنے اس بادشاہ تک رسائی حاصل نہیں ان کے دل میں بھی یہ یقین کامل ہو جاتا ہے کہ بادشاہ جب رحم دل اور عدل و انصاف کا علمبردار ہے ظلم و زیادتی سے کنارہ کشی کرنے والا ہے تو ہماری مشکلات کی اگر اس کو اطلاع ہو گئی تو ضرور ہماری مدد کرے گا اور مشکل وقت میں ضرور ہمارے کام آئے گا، اس کی ان خوبیوں اور کمالات کو مد نظر رکھ کر لوگ اس سے بے پناہ محبت کرنے لگتے ہیں، اسی طرح اللہ سبحانہ و تعالیٰ جو کہ پوری مخلوق کا خالق و مالک اور حقیقی بادشاہ ہے جس نے اپنے بندوں کو آزمانے کے لیے اس دنیا میں مبعوث کیا اور اسی امتحان کی خاطر انہیں حکم کیا کہ وہ ان دیکھے ان پر ایمان لائیں غیب پر ایمان لائیں یہی وجہ ہے کہ اس دنیا فانی کی مخلوق اس فانی دنیا میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کو نہیں دیکھ سکتی اور انسان جس چیز کو نہیں دیکھ سکتا آخر اس کے ساتھ تعلق کس طرح قائم کر سکتا ہے؟ کس چیز کے ساتھ کسی کا تعلق یا تو اس کے حسن و جمال خوبیوں اور کمال کے مشاہدے سے پیدا ہوتا ہے یا اس کی صفات حمیدہ اور اس کی بے شمار خوبیوں کے علم حاصل کرنے سے پیدا ہوتا ہے، جبکہ ہم اللہ سبحانہ و تعالیٰ کو اس دنیا میں نہیں دیکھ سکتے اس لیے ان سے تعلق قائم کرنے کی صرف واحد صورت یہی بچتی ہے کہ ہمیں ان کی صفات اور اسمائے حسنی کا علم ہو جائے پھر جب بندے کو یہ علم ہو جاتا ہے کہ ہمارا رب اللہ خالق بھی ہے مالک بھی ہے تمام مخلوق کی پرورش بھی کر رہا ہے ان کو رزق بھی دے رہا ہے، عدل و انصاف والا ہے، کسی پر ذرے برابر بھی ظلم نہیں کرتا، بندوں پر رحم کرتا ہے ان سے محبت کرتا ہے اور ان کی فریاد رسی بھی کرتا ہے جب بھی اس کو پکارا جائے تو پکار کو سنتا بھی ہے اور قبول بھی کرتا ہے۔ گناہوں کو معاف کرنے والا ہے رات کے آخری حصہ میں دنیا آسمان پر نازل ہو کر بندوں کو پکار پکار کر کہنے لگتا ہوں اور خطاوں کی معافی طلب کرنے کا کہتا ہے۔ اس کے علاوہ بہت ساری صفات حمیدہ کے علم سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ بندہ اپنا تعلق اللہ تعالیٰ سے استوار کر لیتا ہے اور دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے محبت کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ اہل ایمان کے دل میں اللہ تعالیٰ کی اتنی محبت ہوتی ہے کہ دنیا کی کسی چیز سے اتنی محبت نہیں ہوتی، قرآن کریم سورۃ البقرۃ میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

وَلَيَعْلَمَنَّ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَلَيَعْلَمَنَّ اللَّهُ (البقرۃ: ۱۶۵)

”اور جو ایماندار لوگ ہیں وہ تو سب سے بڑھ کر اللہ سے محبت کرتے ہیں۔“

اہل ایمان کی اللہ تعالیٰ سے بے انتہا محبت ہے اور یہ اتنی بڑی محبت یہ تعلق ورثہ صرف اللہ تعالیٰ کی صفات کے علم کا نتیجہ ہے۔

سورۃ ذاریات میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

فَاعْلَمْ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَاعْلَمْ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ (الذاریات: ۵۶)

”کہ میں نے جنوں اور انسانوں کو محض اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔“

اور ظاہر ہے کہ کسی کی عبادت اس کی معرفت کے بغیر تصور میں نہیں آ سکتی، تو اگر بندوں کو رب کی صفات کا علم نہ ہوتا تو اس کی عبادت کس طرح کر سکتے تھے۔ ہمیں وہ غیرہ نے اللہ تعالیٰ کی صفات کا انکار کیا ہے ورنہ وہ گویا اللہ سبحانہ و تعالیٰ معاذ اللہ کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ یا کوئی مستقل ہستی نہیں ہے کیونکہ انسان جو مشاہدات اس دنیا میں کرتا ہے جن کا تعلق چاہے جمادات یا نباتات کی اقسام سے ہو یا حیوانات تک باب سے حیوانات سے مراد جاندار چیزیں ہیں۔ ان تمام کی کچھ نہ کچھ صفات ہیں موجودات میں سے کوئی بھی چیز صفات سے عاری نہیں ہے پھر اگر اللہ تعالیٰ کی کوئی صفت ہی نہیں ہے تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ (معاذ اللہ) اللہ تعالیٰ ایک موبہوم چیز ہے، جس کی کوئی حقیقت نہیں ہے، اور اس سے بڑھ کر کوئی دوسرا کفر یہ عقیدہ نہیں ہو سکتا۔ دوسرے الفاظوں میں یوں سمجھیں کہ جو کوئی اللہ تعالیٰ کی صفات کا انکار کرے وہ گویا اللہ تعالیٰ کے وجود کا انکار کرے ہے۔ خلاصہ کلام کل بندوں کو اللہ کی بندگی کے لیے ضروری ہے کہ ان کے ذہنوں میں اللہ تعالیٰ کی صفات کا علم ہو اور اس علم کے ذمے ان کے دل اور دماغ میں اللہ تعالیٰ کے متعلق صحیح یقین اور تصور قائم ہو سکے کہ میری یہ عبادت اس ذات پاک جل و علی کے لیے ہے جس کی یہ یہ صفات ہیں اور اس سے یہ یقین قائم ہو گا کہ میں کسی موبہوم چیز کی بندگی نہیں کر رہا بلکہ ایک ایسی ہستی کی بندگی کر رہا ہوں جو خود بھی موجود ہے اور دوسری مخلوق کو بھی قائم رکھے ہوئے ہے جو کہ ان ان صفات کمال سے متصف ہے، اور صفات دو قسم کی ہیں۔

(1) صفات ثبویہ (2) صفات سلبیہ

ان دونوں صفات کا علم ہونا ضروری ہے تاکہ انسان کے دل میں اللہ تعالیٰ کے بارے میں صحیح تصور قائم ہو سکے، صفات ثبویہ سے مراد وہ صفات ہیں جو کسی ہستی میں موجود ہوں، مثلاً اللہ تعالیٰ کا غفور، رحیم، شکور، ودود، عادل ہونا اس قسم کی تمام صفات ثبویہ ہیں۔ اور وہ صفات جن کا تعلق عیوب، نقائص، عجز و کمزوری، ظلم و نا انصافی وغیرہم سے ہو اس طرح کی صفات جس میں پائی جائیں وہ اس کے عیوب میں شمار ہوں گی، لہذا جس طرح صفات جلال و کمال کی اثبات اللہ تعالیٰ کے لیے ضروری ہے اس طرح ذات جل و علی سے ان تمام صفات کی نفی بھی ضروری ہے جو نقض و عیوب پر دلالت کرنے والی ہوں۔ اس کی صفات جلال و جمال کے خلاف ہوں، ایسی صفات کو صفات سلبیہ کہا جاتا ہے مثلاً سورۃ اخلاص میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ (الاخلاص: ۴)

”یعنی اس کا کوئی ثانی یا برابر ہی والا نہیں ہے۔“

یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات ان تمام نقائص و عیوب سے پاک ہے جو مخلوق کے اندر موجود ہیں جس طرح سورہ شوریٰ میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ (الشوریٰ: ۱۱)

”اس جیسی کوئی چیز نہیں ہے وہ سنتا اور دیکھتا ہے۔“

لیکن اس کا سننا اور دیکھنا مخلوق کی طرح نہیں ہے بلکہ اس کا سمیع اور بصیر ہونا بے مثل ہے۔ اسی طرح کتاب و سنت میں ہر اس صفت کی نفی کی گئی ہے جس میں ذرہ برابر نقض یا عیب کی بو آتی ہو۔ اب خلاصہ کلام یہ ہوا کہ اللہ نے اپنے بندوں کو اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔ اور عبادت صحیح نمونے پر اس وقت ہو سکے گی جب معبود کا دل میں صحیح تصور قائم ہو یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے حبیب کبریائے اللہ تعالیٰ کی ان تمام صفات کا ذکر کیا ہے جن کی معرفت سے اللہ کے بارے میں جتنا علم ہو سکے وہ ہو جائے۔ اب آپ کو معلوم ہو چکا ہو گا کہ مشابہات جن میں اللہ تعالیٰ کی صفات بھی شامل ہیں ان کو اللہ نے کیوں بیان فرمایا ہے مثلاً بندوں کو یہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ سمیع اور بصیر ہے، اس لیے کہ بندے یہ جان لیں ان کا رب ہر حال میں دیکھ رہا ہے اور ہماری تمام دعائیں سن رہا ہے اور وہ مشکل کشا جل و علی اپنے فضل و کرم سے ان کی دعا کو قبول کرے اور اس مشکل سے اس کو نجات دلائے۔ اسی لیے انہیں بتایا گیا کہ

اللہ تعالیٰ غفار، غفور وغیرہ ہے اس لیے اگر بندوں سے خطائیں اور غلطیاں ہوں تو وہ بالحواس بالکل نہ ہوں بلکہ ان کے دلوں میں وہ یقین اور امید باقی رہے کہ ہمارا مالک وحدہ لا شریک لہ ہے ہر حال بخشنے والا اور بے حد مہربان ہے۔ اس لیے ہم اگر اس کی طرف رجوع کریں گے اور توبہ تائب ہوں گے تو وہ ضرور ہمیں اپنی مغفرت اور رحمت واسعہ سے نوازے گا۔

اسی طرح دوسری صفات ثبویہ کو سمجھنا چاہئے۔ کتاب و سنت میں ہمیں چند کلمات سکھائے گئے ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ کی صفات کے متعلق ہمیں کافی اور شافی علم عطا کرتے ہیں جن کے پڑھنے کی فضیلت وارد ہوئی ہے وہ کلمات یہ ہیں۔ ”سبحان اللہ“ اس کلمہ میں اللہ تعالیٰ سے ہر عیب و نقض اور غامی کی نفی کی گئی ہے۔ یعنی یہ لفظ صفات سلبیہ کی طرف اشارہ کر رہا ہے مگر کسی عیب کی صرف نفی اس کی معرفت کے لیے کامل نہیں ہوتی۔ مثلاً جس طرح کہا جائے کہ فلا شخص یا بادشاہ اندھا نہیں ہے یا لنگڑا نہیں ہے۔ کا نہ یا بصورت نہیں ہے وغیرہ وغیرہ لیکن عیوب کی نفی کے باوجود سننے والے کے دل میں ابھی تک تشکیکی باقی رہتی ہے لیکن جب اس صفات کو ثبوتیہ کا علم ہو جائے تو پھر وہ مطمئن ہو جاتا ہے اور یہ سمجھ لیتا ہے کہ مجھے اس ہستی کے بارے میں کما حقہ معرفت حاصل ہو گئی ہے اس لیے سبحان اللہ کے بعد الحمد للہ کا کلمہ سکھایا کہ وہ تمام عیوب سے پاک ہونے کے ساتھ ساتھ ایسی صفات حمیدہ اور کمالات کا صاحب ہے کہ جس کی وجہ سے وہ واقعتاً اور حقیقتاً ہر چیز کی حمد و ثنا و تعریف کا اہل ہے اس کے بعد تیسرا کلمہ اللہ اکبر ”کا سکھایا گیا ہے کہ انسان کو صفات سلبیہ اور ثبوتیہ کے علم حاصل ہونے کے باوجود اس کو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ وہ خیالات، تصورات اور وہم گمان سے بھی بڑا ہے۔ اس لیے کہا گیا کہ اللہ ہر چیز سے بڑا ہے۔ تاکہ انسان کے دل میں اللہ تعالیٰ کی عظمت اور کبریائی کا ایمان و ایقان مزید پختہ ہو جائے کیونکہ کلمہ ”لا الہ الا اللہ“ کے اندر یہ درس ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات حمادات و کمالات میں دوسری کوئی ہستی شامل شریک نہیں ہے بلکہ وہ اکیلا ہی معبود برحق ہے اس کے علاوہ کوئی بھی معبود برحق نہیں ہے باقی سارے اس کی مخلوقات میں سے ہیں جن کو اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔ جب معلوم ہوا اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کرنے کے لیے اس کی صفات کا علم ضروری ہے اب ہم اصل بات کی طرف آتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا عرش عظیم پر مستوی ہونا بھی اس کی صفات میں سے ایک صفت ہے جس سے بندوں کو آگاہ کرنا اس لیے ضروری تھا تاکہ ان کو اس بات کا علم ہو سکے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ اس کائنات کو پیدا کرنے کے بعد ان سے لائق نہیں ہوا ہے بلکہ جس طرح کوئی بادشاہ تخت بادشاہی پر بیٹھ کر اپنی حکومت چلاتا ہے اس طرح اللہ تعالیٰ اپنے عرش عظیم پر مستوی ہو کر اس کائنات کے کارخانے کو چلا رہا ہے اور دنیا کی ہر چیز پر اس کی نظر ہے۔ آسمان و زمین کو اسی نے تمام ہوا ہے۔ جس طرح سورت فاطر میں فرماتے ہیں:

إِنَّ لِلَّهِ يَكُنُ تَبْوَاتٌ ۖ لَّا تَرْضَىٰ أَنْ تَكُونَ (الطور: ۴۱)

”اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین کو روکا ہوا ہے تاکہ اپنی جگہ سے مل نہ سکیں۔“

اسی طرح سورہ ملک میں فرماتے ہیں:

أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَىٰ عِزِّ قَوْمٍ مَّصَّابٍ ۖ وَبُخْبُضٍ ۚ نَّاصِبٍ ۚ لَا لَظْفِيفٍ ۚ لَّازِمٍ ۚ إِنَّهُ يَمْلِكُ الْبَازِينَ (الملك: ۱۹)

”یعنی کیا یہ انسان نہیں دیکھتے کہ آسمان و زمین کے بیچ میں جو پرندے صفتیں بنا کر اڑتے ہیں اور پہرے لپٹے پروں کو بند بھی کرتے ہیں ان پرندوں کو فضا کے اندر صرف رحمن ہی نے روکا ہوا ہے بے شک وہ وہی ہر چیز کو دیکھنے والا ہے۔“

یہ صرف پرندوں کی مثال نہیں ہے بلکہ اس کی ہر چھوٹی بڑی اور جاندار اور بے جان چیز پر نظر ہے کوئی لہجہ بھی ایسا نہیں کہ وہ اپنی مخلوق سے غافل رہتا ہو، نہ اس کو نیند آتی ہے اور نہ ہی اونچھ اوہلنے عرش سے ہی پورے کائنات

کا نظام چلا رہا ہے اور ان کے تمام امور میں تدبیر کر رہا ہے۔ جس طرح سورہ الم سجدہ میں فرماتے ہیں :

يَوْمَ لَا تَنْفَعُكَ نِعْمَتُ اللَّهِ إِلَّا الْآخِرُ (الم سجدہ: ۵)

یعنی ان کافروں سے تمام باتوں کے ساتھ یہ بھی پوچھو گے کہ اس کائنات کو کون چلا رہا ہے۔

تو جو جواب دیں وہ جواب بھی مذکور ہے۔

فَيَقُولُونَ اللَّهُ (يونس: ۳۱)

”یعنی وہ جواب دیں گے کہ یہ کام اللہ تعالیٰ ہی کرتا ہے۔“

سلف صالحین کا یہ عقیدہ ہے جو کہ صحیح اور اسلم بھی ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے عرش عظیم پر مستوی ہو کر پوری کائنات کو چلا رہا ہے اگر وہ ساتوں آسمانوں سے اوپر اپنے عرش پر مستوی ہے لیکن اس کا علم اور قدرت ہر جگہ موجود ہے اور مخلوق کے ذرے ذرے کو بھی جانتا ہے۔

وَقَدْ عَلِمْتُمُ اللَّائِيْنِ أَنْفُسَهُنَّ يَوْمَ تَأْتِي سُنُوفُهُمْ حُجُرُهُمْ فِي الْأَعْلَىٰ (ق: ۱۶)

”یعنی ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور اس کے دل میں جو خیالات اٹھتے ہیں ان سے بھی واقف ہیں۔“

إِنَّ عِلْمَ الْبَاقَاتِ عِنْدَ اللَّهِ (الملك: ۱۳)

”بے شک وہ سینے کے رازوں کو بھی جانتا ہے۔“

سورہ آل عمران میں فرماتے ہیں :

إِنَّ اللَّهَ لَمَنَّيْ عَلَىٰ شَيْءٍ فَنُبِيٍّ لَّا رَحِيٍّ لَّيْلَةٍ (آل عمران: ۵)

”بے شک اللہ تعالیٰ سے کوئی بھی چیز چاہے وہ آسمان ہو یا زمین میں مخفی نہیں ہے۔“

یعنی کے اللہ تعالیٰ کے عرش پر مستوی ہونے کے باوجود اس کا علم و قدرت ہر جگہ موجود ہے، کوئی بھی چیز اس کی قدرت سے باہر نہیں ہو سکتی۔ البتہ یہ ذہن میں رکھنا ہو گا کہ اللہ تعالیٰ کی تمام صفاتیں بے مثل ہیں۔ یعنی عرش پر مستوی ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ جس طرح دنیا کے بادشاہ کسی بنائے ہوئے تخت پر بیٹھ کر بادشاہی چلاتے ہیں عین اسی طرح اللہ کے لیے بھی کوئی تخت ہے جس پر وہ بیٹھ کر وہ بادشاہی چلاتا ہے۔ اس طرح ہرگز نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے عرش کے متعلق یا اس کی کیفیت کے متعلق ہمیں کوئی بھی علم نہیں ہے صرف اتنا علم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے عرش عظیم کو پیدا کیا جس کے لیے ضروری تھا وہ اس کی شایان شان و عظمت و کبریائی کے مطابق ہو باقی اس پر اس کی ستوی کیفیت یہ بے مثل ہے کیونکہ یہ اللہ کی صفت ہے اور ذات اور صفات کے اعتبار سے کوئی بھی اللہ کے مثل یا نظیر نہیں بن سکتا۔

خلاصہ کلام کے اللہ تعالیٰ کا ساتوں آسمان کے اوپر عرش عظیم پر مستوی ہونا بے مثل ہے جس کی کوئی بھی کیفیت بیان نہیں کی جا سکتی ہاں اس کی قدرت و علم ہر جگہ موجود ہے اس کے برخلاف جمہ، معتزلہ، خوارج اور اشاعرہ یا متکلمین میں سے جو ان کے خیالات سے متاثر ہوتے ہیں انہوں نے استوی میں تاویل کی ہے اور اسے مجاز قرار دیا ہے ان کا کہنا ہے کہ استوی علی العرش کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر غالب ہوا یا عرش اس کے قبضے و قدرت میں ہے۔ جس کی دلیل پر وہ ایک شعر بھی پیش کرتے ہیں کہ

”استواء بشر علی العرانی من غیر سیئت اودم مہراق“

یہاں پر استواء بمعنی استولاع ہے۔ یعنی غالب ہوا، شعر کی معنی ہے بشر غالب ہوا عراقی پر بغیر تلوار چلائے ہوئے اور بغیر خون بہائے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ استوای کا لفظ کبھی تو بغیر صلہ کے استعمال ہوتا ہے جس طرح قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

وَلَقَدْ أَخَذْنَاهُ وَ سَتْوَىٰ (قصص: ۱۴)

”اور جب وہ پسٹھا طاقت کو اور طاقت تمام کو۔“

کبھی یہ ”الی“ اور ”علی“ کے صلہ کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ ”الی“ کی مثال

قرآن کریم میں :

(۱) : يَوْمَ لَا تَدْرِي لَعْنَتُ اللَّهِ عَلَى الْفَاسِقِينَ سَتَوْحَىٰ لِلَّهِ (البقرة: ۲۹)

(۲) : ثُمَّ سَتَوْحَىٰ لِلَّهِ وَحْيٌ دُخَانٍ (الم سجدہ: ۱۱)

سلسلہ کا اجماع ہے کہ یہاں پر اس کی معنی علو اور ارتفاع ہے اور ”علی“ کے صلہ کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔

مثال نمبر ۱: فتنو ۱ علی ظہورہ (الزخرف: ۱۳)

”تاکہ تم ان جانوروں کی پٹھ پر پٹھ کر (سواری کرو)۔“

مثال نمبر ۲: وَ سَتَوْتِ عَلٰی نُجُودِی (ہود: ۴۴)

”یعنی نوح کی کشتی جو دی پہاڑ پر آکر کھڑی ہوئی۔“

اس طرح کی کئی مثالیں قرآن مجید میں موجود ہیں ان تمام سے علو، ارتفاع اعتدال یعنی بلند ہونا، برابر ہو کر بیٹھنا مراد ہے جس پر اہل لغت کا اجماع ہے جب استوی کا صلہ ”علی“ آنے تو ہر جگہ پر معنی بلند نہ ہونا مراد ہوگی جس طرح استوی علی العرش میں ہے۔ تو استوی کو پہلے معنی سے کیوں محروم کیا جا رہا ہے؟ مجاز والی بات قطعاً درست نہیں ہے۔ اس لیے کہ مجاز وہاں پر مراد لیا جاتا ہے جہاں پر حقیقت متعذر نہ ہو، یہاں حقیقی معنی ہرگز متعذر نہیں ہے۔

باقی رہا یہ سوال کہ حقیقی معنی میں مخلوقات کے ساتھ مشابہت لازم آتی ہے تو یہ درست نہیں ہے اس لیے کہ ”استوی علی العرش“ اللہ کی صفت ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفت ویسے ہی بے مثل ہیں جیسے اس کی ذات بے مثل ہے اور مجازی معنی مراد لینے کی دوسری صورت اس وقت پیش آنے لگی جب مجازی معنی والے الفاظ دوسری جگہوں پر زیادہ آنے ہوں ایک یا دو جگہوں پر ایک لفظ آیا ہو جس کے حقیقی معنی ان زیادہ الفاظ کے مخالف ہو پھر ان متعذر مواضع کو مد نظر رکھ کر ایک جگہ پر وارد لفظ کو بھی ان پر محمول کیا ہے لیکن یہاں پر ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ استوی کی معنی استعلاء یا غلبہ اس کی حقیقی معنی نہیں ہے بلکہ معنی ہے لہذا ”استوی علی العرش“ کو اس مجاز معنی پر محمول کرنے کی ضرورت اس وقت پیش آتی جب قرآن کریم میں متعذر بار استولاع علی العرش کے الفاظ آتے ہیں اور پھر ایک دو جگہوں پر ”استوی علی العرش“ کے الفاظ آتے تو پھر ہم اس کی معنی ”استولاع علی العرش“ کرنے کے مجاز ہوتے لیکن قرآن کریم میں ”استولاع علی العرش“ کے الفاظ ایک بار بھی استعمال نہیں ہوئے ہیں۔ اس کے برعکس ”استوی علی العرش“ کے الفاظ ایک دو کیا بلکہ سات آیات میں وارد ہوئے ہیں جن کی تفصیل ہم گذشتہ اوراق میں کرچکے ہیں۔ لہذا ”استوی علی العرش“ کی معنی ”استوی لایع“ کرنا اصولاً بھی غلط ہے اور دوسرا استولاع اور غلبہ کا مطلب یہ ہے کہ جو چیز پہلے قبضہ میں نہیں تھی اس پر غلبہ حاصل کر کے پہلے قبضہ میں کیا جس طرح مذکورہ شعر کا مطلب وہ حضرات اس طرح کرتے ہیں کہ بشر کے قبضہ سے عراق پہلے باہر تھا پھر اس پر غلبہ حاصل کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح کے معنی اللہ تعالیٰ کے قبضہ اور قدرت سے ایک لمحہ بھی باہر نہ تھی نہ ہے اور نہ ہی کبھی ہو سکے گی اس لیے استعلاء اور غلبہ کا مطلب یہاں پر سراسر بے معنی ہے اور دوسری بات کہ عرش تو زمین و آسمان کی پیدائش سے بھی پہلے سے موجود تھا جس طرح اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَبَدَأَ تَزْوِي فَتَوَاتَلَ الْأَرْضُ فِي سِتْرَانِ وَأَمَّا السَّمَاءُ فَفِي سِتْرَانِ (موم: ۷)

”اور اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے جس نے چھ دنوں میں زمین و آسمان کو پیدا کیا اس حال میں کہ اس کا عرش پانی پر تھا۔“

عربی گرامر کا قاعدہ ہے کہ کسی جملہ میں جو حکم ہے وہ اگر جملہ حالیہ کے واو کے ساتھ متقدم ہے تو وہ جملہ حالیہ اس حکم یا خبر سے پہلے ہی ہوتا ہے۔ مثلاً کہا جائے ”جاء زيد و هو راكب“ یعنی زید آیا اس حال میں کہ وہ سوار تھا۔ ”اس کا مطلب یہ ہے کہ زید کے آنے سے پہلے ہی اس کے ہونے کی اس جملہ میں دلالت ہے، اس طرح اس آیت کریمہ کا بھی یہی مطلب ہے کہ زمین و آسمان کی پیدائش سے پہلے ہی عرش پیدا ہو چکا تھا۔ اس وقت عرش پانی پر تھا اگر عرش پہلے سے موجود تھا تو اللہ تعالیٰ نے یوں کیسے فرما دیا کہ:

هَوَاتِي فَتَوَاتَلَ الْأَرْضُ فِي سِتْرَانِ وَأَمَّا السَّمَاءُ فَفِي سِتْرَانِ (الصمد: ۴)

”وہ ذات جس نے آسمان و زمین کو پیدا کیا، پھر عرش پر مستوی ہوا۔“

وغیرہا من الایہ کیونکہ ”ثم تراخی“ اور ترتیب کے لیے آتا ہے۔ اگر یہاں پر استوی سے مراد استولاع لیا جائے گا تو معنی یہ ہوگا کہ زمین و آسمان کی پیدائش کے بعد عرش پر غلبہ حاصل ہوا۔ حالانکہ قرآنی نص اور بخاری وغیرہ کی صحیح احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عرش، زمین و آسمان سے پہلے پیدا ہو چکا تھا، جس پر پہلے ہی اللہ تعالیٰ کو غلبہ اور قبضہ حاصل تھا تو اگر استولاع کے معنی کرو گے تو مطلب یہ ہوگا کہ زمین و آسمان کے بعد اس پر غلبہ حاصل ہوا ہے یہ صریح تناقض ہے جس سے اللہ کا کلام پاک ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَلَوْ كَانَ مِنْ عِندِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ خِلَافًا كَثِيرًا (النساء: ۸۲)

”یعنی اگر قرآن مجید اللہ کی کلام نہ ہوتی تو اس میں بہت زیادہ اختلاف و تناقض دیکھنے میں آتا۔“

لیکن اگر اس کا معنی یہ کیا جائے کہ زمین و آسمان کے پیدا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ عرش پر مستوی ہوا تو اس معنی سے کوئی خرابی نہیں آتی، یعنی عرش عظیم کی تخلیق تو پہلے ہی ہو چکی تھی مگر اس پر استواء زمین و آسمان کی تخلیق کے بعد ہوا۔ اس میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ اور تناقض و تضاد کا شائبہ ہی ہے۔ ”فلینا مل متلون“ باقی جو شعر پیش کیا گیا ہے اولاً تو اس کے قائل کا کوئی پتہ نہیں ہے اور نہ ہی وہ عربوں کے کسی دیوان میں ملتا ہے اس کے باوجود اس شعر میں ایک آدمی کا عراق پر غلبہ کا ذکر ہے اور یہ اس لیے بات صحیح ہو سکتی ہے کہ کوئی ملک کسی کے قبضہ میں نہ ہو پھر اس پر غلبہ حاصل کر کے قبضہ میں لے آتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ معنی قطعاً درست نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ اس کی قدرت سے کوئی بھی چیز پہلے یا بعد میں باہر نہیں ہو سکتی، اس لیے اللہ کا عرش پر مستوی ہونا اس معنی کا ہرگز متحمل نہیں ہو سکتا کہ عرش اس کے قبضہ میں نہیں تھا پھر اس پر غلبہ حاصل ہوا۔ لہذا ”اللہ تعالیٰ کا عرش پر مستوی ہونا“ کی صحیح معنی وہی ہے جو لغت عرب کی رو سے تباور ہے جس کی مثال پہلے ذکر کرچکے ہیں وہی معنی ہے جس کو صحابہ بنائے، تبع تابعین اور سلف صالحین نے ان الفاظ سے سمجھی ہے۔

علاوہ ازیں ہم کہتے ہیں کہ پیش کردہ شعر میں استوی بمعنی استعلاء کے نہیں ہے بلکہ اس کی وہی اصلی معنی ہوگی وہ اس طرح کہ بشر جو کہ عبد الملک بن مروان کے بھائی تھے اور وہ عراق کے امیر تھے۔ سابقہ امراء بادشاہوں اور حاکموں کا یہ دستور تھا کہ جب وہ کسی ملک کی بادشاہی کے لیے آتے تو وہ پہلے تخت شاہی کے اوپر آکر بیٹھتے تھے۔ اسی طرح یہ بشر بھی عراق کا امیر بننے کے بعد پہلے تخت پر مستوی ہو کر بیٹھ گیا اور اس میں کوئی خرابی نہیں ہے اس لفظ کو اپنی اصلی اور حقیقی معنی سے خارج کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہتی بہر حال یہ شعر ہر گز حجت نہیں ہے کہ ”ثم استوی علی العرش“ کے معنی استولاع یا غلبہ ہے جب کہ اس جگہ حقیقی معنی متعذر نہیں ہے تو پھر مجازی معنی کی طرف

جانا اصولاً غلط ہے قرآن کریم میں کتنے ہی مقامات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ تمام مخلوق سے بلند ہے اور انسانی فطرت بھی یہی بتلاتی ہے مثلاً جب بندہ دعا مانگتا ہے تو اپنے ہاتھوں کو آسمان کی طرف اٹھاتا ہے بنی کریم ﷺ دعائے استسقاء کے اندر ہاتھوں کو اٹھاتا تھا کہ بھلوں کی سفیدی نظر آتی تھی اگر اللہ تعالیٰ ہر جگہ موجود ہوتے تو پھر ہاتھوں کو آسمان کی طرف اٹھانے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی بلکہ وہ کام بھی فضول بن جاتا، اس طرح صحیح حدیث کے اندر آتا ہے کہ ایک شخص اپنی لونڈی کو نبی کریم ﷺ کے پاس لے کر آیا جو کہ رقبہ مومنہ کو آزاد کرنا چاہتا تھا آپ نے اس لونڈی سے سوال کیا ”اے اللہ! اللہ کہاں ہے؟ تو انہوں نے آسمان کی طرف اشارہ کیا، پھر آپ ﷺ نے پھجھا کہ میں کون ہوں؟ تو انہوں نے آپ کی طرف اشارہ کیا کہ آپ اللہ کے رسول ہو تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کو آزاد کر دو یہ مومنہ ہے، اگر اللہ تعالیٰ آسمان کے اوپر نہ ہوتے تو آپ ﷺ ہانڈی کے اشارہ کو کس طرح، بحال رکھتے اور کس طرح اس کو مومنہ قرار دیتے؟ اللہ کے رسول سے بڑھ کر کس کو اللہ کے بارے میں معرفت ہو سکتی ہے۔ حجۃ الوداع والی حدیث تو بالکل مشہور ہے جس میں آپ ﷺ نے لوگوں کو چند باتیں پوچھنے اور سمجھانے کے بعد ان سے سوال کیا کہ کیا میں نے اللہ کا پیغام پہنچا دیا؟ تو سب نے جواب دیا یہ ہاں! آپ نے اللہ کا پیغام ہم تک پہنچا دیا۔ اس پر آپ نے اپنی انگلی مبارک آسمان کی طرف اٹھا کر فرمایا۔ ”اللہم اشہد“ اے اللہ اس بات پر گواہ رہنا کہ میں نے تیرا پیغام تیرے بندوں تک پہنچا دیا ہے۔ اگر اللہ کے لیے علو نہ ہوتا بلکہ وہ بی جگہ بذات خود موجود ہوتا تو آپ اپنی انگلی آسمان کی طرف نہ اٹھاتے۔ اسی طرح احادیث صحیحہ میں رات کے آخری حصہ میں دینائے آسمان پر اللہ تعالیٰ کے نزول کا ذکر موجود ہے اگر اللہ تعالیٰ ساتوں آسمانوں سے اوپر عرش عظیم پر نہ ہوتے تو نزول کوئی معنی نہیں رکھتا۔ باقی ان صفات کی کیفیت کے بارے میں کوئی علم ہے اور نہ ہی ہو سکتا ہے اس لیے اس میں تاویلات وغیرہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ قرآن کریم اعلان کرتا ہے :

وَلَا تَقِفْ بِالْقُنْ لَكِ بِرَ عِلْمٍ (بنی اسرائیل: ۳۶)

”ایسی بات کے پیچھے مت پڑو جس کا آپ کو علم نہیں ہے۔“

کتاب وسنت میں جو اللہ تعالیٰ کی صفات وارد ہیں ان پر اسی طرح ایمان لانا ہے جس طرح وارد ہوئی ہیں۔ باقی کیفیات کا علم اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنا ہے۔ باقی قرآن میں یہ جو کہا گیا ہے :

وَبُيِّنَ لَكُمْ آيَاتُ الْكِتَابِ (اصحہ: ۴)

اور اسی طرح سورہ مجادلہ میں ہے :

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يَلْعَنُ بَنِي إِسْرَءِيلَ وَبَنِي النَّصَارَ وَبَنِي الْأَرَمَ بَنِي إِسْرَءِيلَ مِنْ شَرِّ الْأُمَمِ وَأَبْنَاءَ الْيَهُودِ لَا يَخْلَقُونَ إِلَّا بَنِي إِسْرَءِيلَ وَمِنْ أَشْرِكِهِمْ وَكَذَلِكَ لَا تَخْلُقُونَ إِلَّا الْبَشَرِ (المجادلہ: ۲۰)

ان آیات میں اللہ تعالیٰ کا ہمارے ساتھ ہونے کا یہ مطلب ہے کہ وہ علم اور قدرت کے لحاظ سے ہمارے ساتھ ہے، یعنی وہ ہم سے علو شان کے لحاظ سے بہت بلند اور عرش عظیم پر ہونے کے باوجود ہماری ہر نقل و حرکت کا علم رکھتا ہے۔ خود اسی سورہ مجادلہ کے بارے میں ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں اپنے گھر میں بیٹھی ہوتی تھی، بنی صاجہ کا گھر مسجد سے متصل تھا کبھی میں کہ میں سنتی ہوں کہ عورت آپ ﷺ سے اتنی بلکی آواز میں گفتگو کر رہی تھی کہ میں نہ سمجھ سکی کہ وہ کیا کہہ رہی ہے لیکن پاک ہے وہ ذات مبارکہ جو ہر وقت دنیا کی آوازوں کو سنتی ہے اس نے ساتوں آسمانوں سے اوپر اپنے عرش عظیم پر اس عورت کا محاورہ سن لیا۔ اور فوراً وحی بازل کر کے اس عورت کے مسئلہ کو حل کیا اور اس کی شکایت کو دور کیا۔ جیسا کہ سورہ کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے۔

هَذَا صَحَّحَ اللَّهُ قَوْلَ نَحْنُ جَعَلْنَا فِي زُجْجَانَا وَفِي لَيْلٍ لِّلَّهِ لَّا يَمْنَعُ خَاوِزًا إِنَّ لِّلَّهِ سَمْعٌ بَصِيرٌ (المجادلہ: ۱)

”بے شک اللہ تعالیٰ نے سن لیا اس عورت کا قول جو اپنے خاوند کے بارے میں شکایت کر رہی تھی اللہ تعالیٰ آپ دونوں کی گفتگو کو سن رہا ہے بے شک اللہ تعالیٰ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔“

بہر حال اللہ تعالیٰ کی معیت کا مطلب جو ہم نے لیا ہے وہی مستفہ طور پر سلف صالحین سے مستقول ہے باقی اللہ تعالیٰ ہر جگہ باعتبار ذات موجود ہونے کا عقیدہ یا حلولیین، زندقین کا ہے یا متاخرین، متکلمین اور آج کل کے دیوبندی حضرات کا ہے جو کہ سلف صالحین کے عقیدے کے برخلاف ہے۔ قرآن کریم میں تحویل قبلہ کے بارے میں ہے :

هَذَا رَمَى قَلْبِ دَبْكَةٍ فِي لَيْلٍ فَتَوَلَّيْتُ لِقَابِ رَبِّي (البقرة: ۱۴۴)

”بے شک ہم آپ کے بار بار چہرہ آسمان کی طرف کرنے کو دیکھ رہے ہیں پھر ہم ضرور اس قبلہ کی طرف منہ کرنے کا حکم کریں گے جس کو آپ پسند کرتے ہیں۔“

بنی کریم ﷺ بار بار آسمان کی طرف کیوں دیکھتے تھے؟ اس کا صاف جواب یہ ہے کہ چونکہ وحی آسمان سے نازل ہوتی تھی آپ اس شوق میں بار بار اوپر دیکھتے کہ کب وحی نازل ہوتی ہے کہ اللہ کی طرف منہ کرنے کا حکم کی، اور وحی کا اوپر سے نازل ہونا اس حقیقت پر واضح دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ساتوں آسمانوں سے اوپر ہے اور وہیں سے وحی کو نازل کرتا ہے تو خود قرآن سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں سے اوپر ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

عَلَى زُجْجَانَا وَفِي لَيْلٍ لِّلَّهِ سَمْعٌ (النساء: ۱۵۰)

”کہ اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ کو اپنی طرف اٹھایا۔“

احادیث صحیحہ جو کہ تواتر کی حد تک پہنچ چکی ہیں ان میں اس کی تفسیر اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ آسمان کی طرف اٹھایا اگر اللہ تعالیٰ آسمانوں سے اوپر نہ ہوتے تو یوں کس طرح فرماتے ہیں کہ اللہ نے ان کو اپنی طرف اٹھایا، آخر میں اتنا عرض کریں کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے ہر جگہ حاضر ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں یا اس کے قائل ہیں تو ان کے اس قول سے یہ بات لازم آئے گی کہ نعوذ باللہ، اللہ تعالیٰ، بیت الخلاء، گندی جگہیں، بد اخلاقی کے محلات اور شراب و زنا کے آڈوں میں موجود ہیں۔ اور پھر اس کے قیہ میں جو خرابی لازم آئے گی اس کی سنگینی کوئی بھی عقلمند انسان بے خبر نہیں رہ سکتا۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے ایک روایت مردی ہے جو کہ مسند احمد، ابن ماجہ، نسائی، ابن ابی حاتم اور ابن جریر کی تفاسیر اور عثمان بن سعید دارمی ابن کتاب ”الرد علیٰ بتر المریس“ میں لائے ہیں جس کو امام بخاری اپنی صحیح کے

فتاویٰ راشدیہ

صفحہ نمبر 126

محدث فتویٰ

